Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اگلے روز شام کے وقت اچانک سرفراز گھر آ پہنچا۔ اُس نے بتایا کہ اُس کی پوسٹنگ مشرقی پاکستان کی ہوگئی ہے۔ چھ ماہ پہلے اُس کی رجمنٹ مشرقی پاکستان جا چکی تھی۔ مگر اُس وقت سرفراز کی پوسٹنگ عارضی طور پہ ایک دُوسری رجمنٹ میں کر دی گئی تھی۔ اب افسروں کی کمی کی وجہ سے اُسے اَپنی پیرنٹ رجمنٹ میں واپس آنے کا بلاوا آ گیا تھا۔

کچھ دیر پہلے اَپنے دِل سے مجبور ہو کر سرفراز نے نسیمہ سے منگنی کی بات چھیڑی تھی۔ نسیمہ کا اِبتدائی ردِ عمل گھبراہٹ کا تھا، اَور اُس نے بات ٹالنے کے انداز میں کوئی اَور ذکر شُروع کر دیا تھا۔ مگر جس خوشگواری سے وہ بات کرتی رہی تھی اُس سے ظاہر تھا کہ وہ سرفراز کی جانب سے اِس تجویز کی متوقع تھی۔ اگلی ملاقاتوں پہ سرفراز نے بہانے بہانے سے بات جاری رکھی۔ اب جبکہ سرفراز کا مشرقی پاکستان جانے کا موقع آ گیا تو اُس نے گھر آ کر اعجاز سے بات کی۔ اعجاز ہکا بکا رہ گیا۔ سرفراز کے گھر والوں کے خواب میں بھی نہ تھا کہ اُس کے نسیمہ کے ساتھ تعلقات اِس حد تک پہنچ چکے تھے۔ مگر جلد ہی اَپنی حیرت پر قابو پا کر اعجاز نے خوشی سے تفصیل پُوچھنی شُروع کی۔

"میرے پاس صرف تین دِن ہیں،" سرفراز نے بتایا۔ "میری فلائٹ بک ہو چکی ہے۔ میں نسیمہ سے مل کر آیا ہُوں۔ لالہ تم کل جاؤ اَور بریگیڈیئر صاحب سے بات کرو۔ اکیلے ہی جاؤ، ان کے گھر میں کوئی عورت نہیں ہے۔ پھر پرسوں تم اَور بی بی جا کر جو بھی رسم کرنی ہے کر آنا۔"

"اِتنی جلدی میں سب کچھ کیسے ہو گا؟" اعجاز نے کہا۔

"ہو جائے گا۔ بریگیڈیئر صاحب کو پتا ہے میں جا رہا ہُوں۔ کسی اَور کو بتانے لیجانے کی ضرورت نہیں۔ وقت تنگ ہے۔ سب لوگ سمجھ جائیں گے۔ بس رسم ہی کرنی ہے۔"

"ہاں ہاں، رسم ہی تو کرنی ہے،" سکینہ بولی۔ "میری چار مندریاں ہیں۔ سب سے بہتر لال نگوں والی ہے۔ جا کر پہنا آئیں گے۔"

"موٹے موٹے نگوں والی؟" سرفراز نے پُوچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہاں۔"

"نہ نہ۔ وہ نہ پہنانا۔"

"کیوں؟"

"وہ تو ایسے لگتی ہے جیسے ہاتھ پر پھوڑے نکلے ہوئے ہوں۔"

"جا او جا، بڑا آیا ہشیار۔ پورے تولے کی مندری ہے۔"

"بی بی، میری بات سنو،" سرفراز ہاتھ جوڑ کر بولا، "وہ ایک سادہ سا چھلا ہے ناء تمہارے پاس، وہی ٹھیک ہے۔ منگنی کا چھلا ہی ہوتا ہے۔"

"میرا ساٹن کا نیا سوٹ بھی پڑا ہے۔ وہ لے جائیں گے۔"

"کپڑوں کی کوئی ضرورت نہیں،" سرفراز نے کہا۔ "بس بات ہی کرنی ہے، اور نشانی کے طور پر چھلا پہنانا ہے۔"

"ہائے کچھ نہ کچھ تو ساتھ ہونا چاہئے۔"

"پھل اور مٹھائی لے جائیں گے،" اعجاز نے کہا۔

"ٹھیک ہے،" سرفراز بولا۔

"ہائے، وقت ہوتا تو تولے کا چھلا بنواتی۔ تیرے لالے کی جیب ہلکی کراتی۔"

اعجاز نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور نکال لیا۔ "دیکھ، میری جیب میں کچھ بھی نہیں۔"

"ہاں ہاں،" سکینہ سرفراز سے مخاطب رہی۔ "مجھ سے کہتا ہے بنک میں پیسے رکھتا ہوں۔ میں نے کبھی نہیں دیکھے، نہ مجھے کاپی دکھاتا ہے۔ اللہ جانے کس کس کے اوپر خرچ کرتا پھرتا ہے۔"

"بس تو اپنا راگ چھیڑ دے،" اعجاز بولا۔ "موقعہ محل نہ دیکھا کر۔"

"میں نے بھی جانا ہے،" حسن نے کہا۔

"میں نے بھی،" حسین بولا۔

"ابا کہے گا اُسے نہیں پوچھا،" سکینہ نے کہا۔

"بی بی خدا کے لئے اپنا برقعہ پہن کر نہ جانا،" سرفراز نے کہا۔

"کیوں، برُکے کو کیا ہے؟ ریشمی کپڑے کا ہے۔"

"نہ نہ، کوئی چادر اوڑھ لینا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"باسا بھی چھٹی پر آیا ہے۔ وردی شردی پہن کر اچھا لگتا ہے،" سکینہ نے کہا۔

"باسے نے اُدھر کوئی پہرہ دینا ہے۔ کوئی ضرورت نہیں۔"

"ابا ابا، ٹانگے پر جائیں گے؟"

"ہائے ہائے خوشی کا موکا ہے۔ بندے شندے ساتھ جائیں تو عزت ہوتی ہے۔"

"ابا، سالم ٹانگہ کرائیں گے؟"

سب ہیجانی کیفیت میں بول رہے تھے۔ اعجاز نے دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھائے۔ "چپ کرو۔ سب چپ کرو۔ کوئی بات طے ہونے دو۔ بس ٹھیک ہے، فائنل ہو گیا۔ میں صبح صبح نِکل جاؤں گا۔ بریگیڈیئر سے بات کر کے دوپہر تک واپس آ جاؤں گا۔ اگر وہ رضامند ہو گیا تو کل شام کو ہی رسم کر آئیں گے۔ اِس طرح سرفراز کو ایک پُورا دِن گھر پر مل جائے گا۔"

"ہاں لالہ، بالکل ٹھیک پروگرام ہے۔"

"سرفرازے، تو بڑے بڑے کام اتنی جلدی میں کرتا ہے،" سکینہ نے شکایت کی۔

"نہ خوشی کی نہ ڈھول ڈھمکا۔"

"بی بی، جب میں واپس آؤں گا تو جتنا مرضی ہے ڈھول ڈھمکا کر لینا۔ اب وقت نہیں ہے۔ تمہیں پتا ہے جہاں میں جا رہا ہوں اُدھر جنگ کی حالت ہے؟"

"ہائے اللہ،" سکینہ نے اُنگلیاں دانتوں میں دبا کر تائید کی خاطر اعجاز کو دیکھا۔ اعجاز نے خاموشی سے مُنہ دُوسری طرف موڑ لیا۔

"اللہ تجھے اَپنی امان میں رکھے۔ اِمام ضامن باندھ کے بھیجوں گی تمہیں۔"

"چل یار،" اعجاز نے سرفراز سے کہا۔ "زمین کا چکّر لگا کے آئیں۔ کوئی بات وات بھی کریں۔ یہاں تو شور مچا ہوا ہے۔"

دونوں بھائی اُٹھ کر گھر سے باہر نِکل گئے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حِصّہ ششم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کانٹوں کی زباں خشک ہُوئی پیاس سے یا رب
اِک آبلہ پا اِس وادئ پُرخار میں آوے"

غالب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

باب 14

"ہاؤ آر یو فیلنگ ٹوڈے؟" کیپٹن عمران نے سرفراز کو آنکھیں کھولتے ہُوئے دیکھ کر پوچھا۔

"آئی ایم آل رائیٹ،" سرفراز نے ذرا سا سر موڑ کر جواب دیا۔

"بیٹر؟"

"مچ بیٹر۔"

"خوش قسمت ہو یار، ایکشن سے تھوڑی دیر ہی پہلے پہنچے۔"

سرفراز ہلکا سا مُسکرا کر چپ ہو رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ خوش قسمت ہے کہ بدقسمت؟؟

"مجھے دس مہینے ہو چلے ہیں۔ سارا سین دیکھ چکا ہُوں۔ فرسٹ ایکٹ سے لے کر ڈراپ سین تک،" کیپٹن عمران پھر بولا۔ "اَینی نیوز اباؤٹ کیپٹن جمیل؟ میں سہلٹ میں تھا تو اُسے ایویکوئیٹ کیا گیا تھا۔"

"ہی ایکسپائرڈ،" سرفراز نے آہستہ سے جواب دیا۔

"اوہ، شِٹ!"

دونوں کچھ دیر خاموش لیٹے رہے۔

"بلڈی شیم،" کیپٹن عمران پھر بولا۔ "فرسٹ ریٹ بوائے۔ ایبسولیوٹلی فرسٹ ریٹ۔" وارڈ میں دونوں کے بستر ساتھ ساتھ تھے۔ کیپٹن عمران کی بائیں ٹانگ گھٹنے سے نیچے کاٹ دی گئی تھی اَور اُس کی ران کا ٹنڈمنڈ تنا، جِس کے سرے پر سفید پٹیوں کا موٹا سا گولا بنا تھا، لوہے کے جنگلے پہ رکھا ہوا اُوپر کو اُٹھا تھا۔

سرفراز کو بائیں کولہے پہ زخم آیا تھا مگر خطرناک نہ تھا، شرپنل نے مارا اندر تک نہ کی تھی اَور جلد کافی سرعت سے ملتی جا رہی تھی، گو اِس کا ابتدائی صدمہ اِس قدر شدید تھا کہ سرفراز چار روز تک نیم بیہوشی کی حالت میں پڑا رہا، جِس کے دَوران اُسے کئی بوتل خون دیا گیا۔ آج اُسے مکمّل ہوش میں آئے دُوسرا دِن تھا۔ پہلے روز اُس نے آنکھ کھولی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تو عمران نے اَپنا تعارف کرایا۔

"کیپٹن عمران، فور ایف ایف۔"

جواباً سرفراز نے کہا۔ "کیپٹن سرفراز، سِکستھ پنجاب۔" پھر سرفراز نے سوالیہ اَنداز میں اُس کی کٹی ہُوئی ٹانگ کی جانب اِشارہ کیا۔

"اوہ دِس،" کیپٹن عمران نے اَپنی ٹانگ کو دیکھا۔ "کانوائے بامبڈ۔ ڈائیرکٹ ہٹ۔" پھر اُس نے سرفراز کے زخم کی جانب ہاتھ اُٹھا کر پُوچھا "واٹ ہیپنڈ؟"

"گرنیڈ اٹیک،" سرفراز نے مختصراً جواب دیا۔

"فیلڈ؟"

"نو۔ آفیسرز میس۔"

"اویس آئی ہرڈ اباؤٹ اِٹ۔ ٹیرراَ ٹیک۔" عمران نے سنجیدگی سے سَر ہلا کر کہا۔ "فِیلنگ بیٹر؟"

سرفراز نے اِثبات میں سَر ہلا کر جواب دیا۔ "اینڈ یو، سر؟"

"آئی وِل سروائیو،" عمران نے مُسکرا کر جواب دیا۔

اس کے بعد جیسے ہی سرفراز نے سَر موڑ کر دیکھا ایک مسلح سکھ سپاہی بستروں کی قطاروں کے بیچ راؤنڈ کرتا ہوا اُن کی جانب چلا آ رہا تھا۔ وہ گہری نظروں سے اُنہیں دیکھتا ہوا گزُر گیا۔ سرفراز آنکھیں پھاڑے اُسے دیکھتا رہا۔ سکھ سپاہی سرفراز کو اَپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر ہلکا سا مُسکرایا۔ سرفراز نے وارڈ کے دُوسرے دروازے کی جانب دیکھا۔ وہاں ایک اَور مسلح سپاہی کھڑا تھا۔ سرفراز نے پھیلی ہُوئی آنکھوں سے کیپٹن عمران کو دیکھا۔ عمران کے چہرے پہ تلخ سی مُسکراہٹ تھی۔ اُس نے کندھوں کو خفیف سی حرکت دی۔

"سرنڈر،" وہ بولا۔ "بلڈی شیم۔"

سرفراز سن لیٹا چھت کو دیکھتا رہا۔

"اَیز آئی سیڈ، خوش قسمت ہو۔ ساری سیریمنی سے سوئے سوئے گزُر گئے۔"

سرفراز کو اب کیپٹن عمران کی باتوں پہ غصہ آ رہا تھا۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ اَپنی ڈرپ کی ٹیوب کو کھینچ کر نکال دے اَور کود کر سکھ سپاہی سے رائفل چھین لے۔ اِسی جوش میں اُس کا اُوپر کا دھڑ چھ انچ تک بستر سے اُٹھا، پھر واپس گر گیا۔ ایک منٹ تک اسی تلاطم سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گزرنے کے بعد اُس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔

دوسرے دِن تک اُس کے حواس نے صورِت حال کو کم و بیش قبول کر لیا تھا۔ کیپٹن عمران نے اُس کا حال احوال پُوچھا۔ پِھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔

"آئی سے، اباؤٹ دی اَٹیک آن افیسرز میس۔ دے سے کہ بنگالی افسروں نے پہلے ہی ڈائیو لگا دی تھی؟"

"مجُھے کچھ یاد نہیں،" سرفراز نے کہا۔

"آبویئسلی دے ورِان دانو۔"

"پاسبل،" سرفراز نے سَر ہِلا کر اتفاق کیا۔

"باسٹرڈز۔ تم نے کوَر نہیں لیا؟ سلو، وَریُو؟"

"مجُھے یاد نہیں، سر،" سرفراز نے جواب دیا۔

مگر اُسے اچھی طرح سے یاد تھا۔ کیپٹن عمران نے درست سنا تھا۔ کھانا کھاتے کھاتے بنگالی افسروں نے اچانک جستیں بھرنی شُروع کر دی تھیں۔ چشم زدن میں وہ میزوں کرسیوں کے نیچے غائب ہو گئے تھے۔ چند سیکنڈ کے بعد کھڑکی کے راستے پھینکا گیا گرینڈ لڑھکتا ہوا آ کر سرفراز کے پاؤں سے کچھ فاصلے پر رُک گیا۔ وہ کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ پِھر اُس وقت ایک عجیب واقعہ ہوا۔ سرفراز اَپنی تمامتر آرمی ٹریننگ کو بھول گیا اَور اَپنے پاؤں پہ کھڑا اُس گرینڈ پہ نظریں جمائے دیکھتا رہا۔ اُس کی نظروں میں کبھی وہ اُٹھ کر اس کی آنکھوں کے قریب آ جاتا حتیٰ کہ سرفراز اُس کے پائن اَیپل کی ساخت والے، ایک دوسرے کے ساتھ جمے ہُوئے چانے الگ الگ دیکھ سکتا تھا۔ پِھر دُوسرے ہی لمحے وہ نظر سے دور ہوتا ہوا، زمین کو اَپنے ساتھ لیتا، ہٹتا ہٹتا ایک چھوٹے سے کالے دھبے میں تبدیل ہو جاتا۔ جَب وہ قریب آتا تو سرفراز کے دِل میں خیال آتا کہ کیا یہ اب پھٹے گا؟ پھٹے گا تو پِھر کیا ہو گا۔ اس خیال کے باوجود وہ اَپنی جگہ سے ہلنے سے قاصر رہتا۔ اگلے لمحے جیسے ہی وہ سیاہ گیند پرے ہٹنے لگتا اُس کے پھٹنے کا خیال مٹ جاتا اَور سرفراز عجیب طرح سے اَپنے آپ کو محفوظ تصور کرنے لگتا۔ ایک سیکنڈ کے بعد دُوسرا سیکنڈ گزُر گیا۔ "گیٹ ڈاؤن،" کسی نے چیخ کر کہا، "گیٹ ڈاؤن یُو فول۔"

سرفراز گویا نیند سے جاگ اُٹھا۔ اُس نے پلٹ کر مُنہ کے بل زمین کی جانب جست

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھری۔ وہ ابھی ہوا میں ہی تھا کہ گرنیڈ ایک دھماکے سے پھٹ گیا۔

"مے بی،" سرفراز نے کہا، آئی واز اے بِٹ سلو سر۔"

"ڈیم بیڈ لک،" عمران نے کہا۔

ڈاکٹروں کے مختصر راؤنڈ اور ڈریسنگ وغیرہ کے بعد وہ سارا دِن مکمل طور پہ فارغ ہوتے تھے۔ سرفراز اور عمران کے بستروں کے سامنے دیوار میں بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں۔ اُن سے پرے پچیس گز تک زمین خالی تھی اور اُس سے آگے خاردار تاروں کی دو باڑیں تنی تھیں۔ اُن کے بعد ایک وسیع کھیت تھا جو غیر آباد پڑا تھا۔ کھیت میں جگہ جگہ خُود رو جھاڑیاں اور کہیں کہیں گھاس اُگی تھی۔ اُس کھیت میں دِن بھر ایک بکری پھرتی رہا کرتی تھی۔ بکری کا معمول تھا کہ وہ باڑ کے ساتھ ساتھ، گھاس اور جھاڑیوں پہ مُنہ مارتی ہوئی، اُوپر سے نیچے اور نیچے سے اُوپر چکّر لگاتی رہتی تھی۔ سرفراز اور عمران کے لِئے جو اپنے اپنے بستروں میں قید تھے اور کرنے کے لِئے جن کے پاس دِن بھر کوئی کام نہ تھا، بکری آزاد فضا کی علامت تھی۔ وہ بیٹھے بیٹھے اُس بکری کو دیکھتے رہا کرتے تھے۔ آخر ایک روز اُنہوں نے ایک کھیل شُروع کر دیا۔ وہ بکری کے چکّر گننے لگے۔

تین کھڑکیوں میں باری باری بکری کا سر نمودار ہوتا اور بائیں جانب غائب ہو جاتا۔ تقریباً دس یا بارہ منٹ کے بعد اُس کی واپسی ہوتی۔ آخری کھڑکی میں اُس کا سر دکھائی دیتا، پھر تینوں کھڑکیوں کے سامنے سے گزُر کر وہ دائیں طرف کو چلی جاتی۔ اِسی طرح وہ دائیں اور بائیں ٹہلتی رہتی۔ کھیل کے دو مختلف حصے تھے۔ پہلا حصہ بکری کے سر کو دائیں یا بائیں جانب کی کھڑکی میں دیکھ کر "سنیپ" کہنے کا تھا۔ جو کوئی ایک سیکنڈ دیر کر دیتا اُس کا ایک نمبر کاٹا جاتا تھا۔ ایک نمبر کی قیمت ایک روپیہ رکھی گئی تھی۔ دوسرا حصہ دِن کے آخر میں بکری کے کل چکّروں کا شمار تھا۔ کاغذ، قلم دستیاب نہ تھے، اِس لِئے حساب دماغ میں رکھنا پڑتا تھا۔ دِن کا وقت گزارنا سب مریضوں کا مسئلہ تھا۔ پہرے داروں کی ہدایت کے مطابق آپس میں کم سے کم گفتگو کی اجازت تھی۔ نہ زبان اور نہ ہی ہاتھ، پیر ہلانے کو، اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہ دماغ خرچ کرنے کو کچھ تھا۔ چنانچہ جب سرفراز اور عمران کے آس پاس کے بستروں والے لوگوں نے کسی حد تک کھیل کے اُصول سمجھ لیے تو وہ بھی بن بلائے اُس میں شریک ہوگئے۔ افسر، جونیئر کمشنڈ اور نان کمشنڈ سب ملے جلے اِس وارڈ میں پڑے تھے۔ کھیل صرف دو دو کے جوڑے آپس میں کھیلتے تھے اور جوڑے بنانے میں رینک کا خیال رکھا جاتا تھا۔ کھیل کی حد تک جو الفاظ بولے جاتے تھے اُن میں پہرے دار بھی مخل نہ ہوتے تھے۔ کسی جوڑے میں سے کوئی ایک اگر نیند کے غلبے میں آ جاتا تو تین روپے فی منٹ کے حساب سے کاٹ کر اُس کے منفی کھاتے میں ڈال دیئے جاتے تھے۔

کھیل کے پہلے حصے کا حساب رکھنا آسان تھا۔ کھڑکی میں بکری کا سر دیکھ کر پہلی آواز لگانے والوں کا حساب رکھنا صرف ایک ایک روپیہ اُوپر نیچے کرنے کا معاملہ تھا اور ہر دس بارہ منٹ کے بعد نئی رقم نِکل آتی تھی۔ مگر دِن بھر کے پھیروں کا حساب یاد رکھنے میں مشکل پیش آتی تھی، جِس پہ بعض اوقات اختلاف پیدا ہو جایا کرتا تھا۔

"تیس پھیرے،" بکری کے رخصت ہونے پر کیپٹن عمران کہتا۔

"اونہوں،" سرفراز نفی میں سر ہلاتا۔ "اِکتیس۔"

"تیس۔"

"اِکتیس۔"

"بیٹ؟"

"اوکے۔" سرفراز اتفاق کرتا۔

"سو؟"

"آئی کانٹ افورڈ اِٹ،" سرفراز کہتا۔

"ففٹی؟"

"ٹونٹی فائیو۔"

"ڈن،" عمران کہتا۔ "کیوں صوبیدار صاحب، کتنے چکر ہوئے؟"

"اِکتی سر،" صوبیدار خُدا داد خان، جِس کا ایک پیر زخم کی وجہ سے گل چکا تھا، فیصلہ کن انداز میں کہتا۔

کیپٹن عمران کے مائنس حساب میں پچیس روپے ڈال دیئے جاتے۔ "لائیرز!"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیپٹن عمران زیرلب بڑبڑاتا۔ رقوم کالین دین گونی الوقت خیالی تھا، مگر اُس پہ جو لے دے کی جاتی وہ اَپنی اَپنی عزت قائم رکھنے کا بہانہ بن گئی تھی۔ درحقیقت بکری ان لوگوں کے لئے زندگی کا سہارا بن چکی تھی۔

شام ہونے سے کچھ پہلے جب بکری کا مالک اُسے لے کر چلا جاتا تو بتیاں بجھانے کے گھنٹے تک اُن کے لِئے وقت گزارنا مشکل ہو جاتا تھا۔ وہ بے رونق چہرے لئے اَپنے اپنے بستروں پہ اَیسے لیٹے اَور بیٹھے ہوتے جیسے کوئی عزیز ہستی اُن سے بچھڑ گئی ہو۔

"اگر ایک روز مالک نے بکری کو ذبح کر کے کھالیا تو؟" ایک سپاہی کہتا۔

"ہندو ہے،" دُوسرا جواب دیتا، "اُس کی لِٹ نہیں دیکھی؟ یہ لوگ گوشت نہیں کھاتے۔"

"اگر اُس نے بیچ دی تو؟" پہلا اَپنا نظریہ یاسیت جاری رکھتا۔

"دودھ دینے والی ہے،" تیسرا کہتا، "مالک کبھی نہیں بیچے گا۔"

"تجھے کیسے پتا ہے دودھ دیتی ہے؟"

"میں نے اُس کے تھن دیکھے تھے۔ بھرے ہُوئے تھے۔"

"تھن تو نظر ہی نہیں آتے۔"

"ایک دِن میں اُٹھ کر بیٹھا تھا۔ ہاتھوں پر اُٹھ کر تھن دیکھے تھے۔"

"تمہارے چوتڑوں پر زخم ہیں۔ تم بیٹھ نہیں سکتے۔"

"ایک دِن بیٹھا تھا،" تیسرا تنگ آ کر کہتا، "اُسی دِن سے تو زخم زیادہ خراب ہو گئے ہیں۔ لیٹا لیٹا تھک گیا تھا۔"

پہریدار آ کر اُنہیں باتیں کرنے سے منع کر دیتا۔

جب بکری چکّر لگا رہی ہوتی تو سامنے کے مریضوں کی قطار بستروں پر دراز، نیم دراز چوکنی بیٹھی ہوتی اَور کئی سَر ایک ساتھ وقفے وقفے پر دائیں سے بائیں اَور بائیں سے دائیں ہل رہے ہوتے۔ بکری کو کبھی کسی طور اِن لوگوں کے ساتھ اپنے تعلق کی آگاہی ہو چکی تھی۔ سرفراز کو یقین تھا کہ بکری سیدھا مُنہ اُٹھا کر اُنکی جانب نہیں دیکھتی بلکہ کنکھیوں سے اُنہیں بھانپتے ہُوئے گزُرتی ہے۔ کئی اَور وجوہات کی بنا پر بھی سرفراز بکری کی خصوصیات کا قائل ہو چکا تھا۔ مثلاً بکری کبھی باڑ سے پرے میدان میں نہ جاتی تھی گو اُس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میدان میں کئی جھاڑیاں اُگی تھیں اَور ایک دو جگہ پر سبز گھاس خاصی گھنی تھی، بلکہ وہ ہمیشہ باڑ کے برابر ہی آگے پیچھے سفر کرتی تھی۔ سرفراز کو اِس میں کوئی شبہ نہ تھا کہ اِتنے سارے مردوں کے مقابل بکری کو اَپنی نسوانیت کا احساس ہو چکا تھا۔ اِس خیال سے سرفراز کی نظر میں بکری اِس حد تک پر کشش ہو گئی تھی کہ اُسے بکری کی چال میں اٹھکیلیاں نظر آتی تھیں اَور اُس کے ہر دم ہلتے ہُوئے ہونٹے اَور گھاس پات سے بھرے بھرے گال اُسے دلکش دکھائی دینے لگے تھے۔

جس روز اُس مقام سے، جو ایک سکُول کو خالی کرا کے ہسپتال میں تبدیل کیا گیا تھا، اُٹھا کر اُنہیں لے جایا گیا اُس روز لوگوں نے دیکھا کہ بکری مُتعدّد بار کھڑکیوں کے سامنے رُک رُک کر اُن کی جانب مُنہ اُٹھائے کھڑی رہی اَور "میں میں" کرتی رہی۔ اُس کو اَپنے چاہنے والوں کے کُوچ کی خبر ہو چکی تھی۔ سرفراز کی قطار والے لوگوں کی عجیب گومگو کی حالت تھی۔ ایک طرف تو اُن کے اندر ہسپتال سے اُٹھ کر، جہاں اُن کی زندگی ایک ڈھب پہ قائم ہو چکی تھی، کسی نامعلوم مقام پہ لے جائے جانے کا ہیجان تھا۔ دوسری جانب بکری سے بچھڑ جانے کا غم تھا اَور آگے روٹین کا کچھ علم نہ تھا۔ اِن کے برعکس مقابل کی قطار والے لوگ، جنہوں نے پہلے پہل اِس کھیل میں شامل ہونے کی سعی کی تھی مگر بکری والی کھڑکیوں کی جانب پُشت ہونے کے باعث ناکام رہے تھے، کم از کم بکری کے غم سے آزاد تھے۔ آخری لمحوں میں جمعدار سلیم نے مُنہ کھولا۔ وہ تیس سالہ میٹرک پاس نوجوان ادبی ذوق کا مالک تھا اَور پُرانے پُرانے شاعروں کے سینکڑوں شعر اُسے ازبر تھے جنہیں وہ موقعہ محل کی مناسبت سے پڑھتا رہتا تھا۔ جنگ کے دوران اُس کا چہرہ اَور سینہ بری طرح جھلس گیا تھا اَور پٹیاں اِس طرح بندھی تھیں کہ صرف ناک، منہ اَور آنکھوں کے سوراخ کھلے تھے۔ جَب اُس کی پٹی کی جاتی تھی تو جلد چیتھڑوں کی مانند اُترتی تھی اَور دُوسرے مُنہ پھیر لیتے تھے۔ مگر اُس کو اَپنے شعر کبھی نہ بھولے تھے۔ سرفراز کا خیال تھا کہ انہی شعروں کی مدد سے وہ ابھی تک زندہ تھا۔ جَب اُسے سٹریچر پہ ڈالا جا رہا تھا جمعدار سلیم نے بکری کی جانب مُنہ اُٹھا کر آخری شعر پڑھا۔ "یوں اُٹھے آج اِس گلی سے ہم، جیسے کوئی جہاں سے اُٹھتا ہے۔"

اِس طرح وہ اَپنے مشکل وقت کی اُس بے زُبان ساتھی سے جدا ہُوئے جس نے اُن کے لِئے ایک انسان کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ڈیر سٹ چھیمی،" سرفراز نے لکھنا شروع کیا، "یہاں جو حادثہ رونما ہوا ہے اُس کا تمہیں علم ہو گیا ہو گا۔ اِس بڑے حادثے سے چند روز قبل ایک چھوٹا سا حادثہ میرے ساتھ پیش آ گیا تھا جس کی وجہ سے مجھے کچھ دِن ہسپتال میں گزارنے پڑے تھے۔ مگر اب میں بالکل تندرست ہوں، فکر کی کوئی بات نہیں۔ ہسپتال سے فارغ ہونے کے بعد ہمیں ٹرین سے نارائن گنج، پھر سٹیمر کے ذریعے دریائی راستے سے لے جایا گیا۔ رات کے وقت سٹیمر ایسی جگہ پہ کھڑا کیا جاتا جہاں دریا مگرمچھوں سے بھرا ہوا ہوتا تھا تاکہ ہم میں سے کوئی فرار نہ ہو سکے۔ اِس طرح ہم کلکتے پہنچے۔ وہاں سے پھر ٹرینوں پر سوار کرا کے اِس شہر میں پہنچایا گیا جس کا نام رانچی ہے۔ اب ہم شہر کے باہر کیمپ نمبر اٹھانوے میں مقید ہیں۔ اِن حرامیوں نے ہمیں نظر بند کرنے کے لِئے کیج تیار کر کے رکھے ہیں۔ کیج، یعنی پنجرے۔ میں کیج نمبر تین میں ہوں۔ ان کیجز کا نقشہ اِس طرح ہے۔ عام فوجی بیرکیں ہیں جو سپاہیوں کے لِئے بنی ہوتی ہیں۔ ایک ایک میں چار چار، چھ چھ، آٹھ آٹھ آدمی ہیں۔ بیرکوں میں ہمارے سونے کے لِئے چارپائیاں ہیں۔ ہمارے کیج میں تقریباً اسّی بیرکیں ہیں۔ جو چیز انہیں پنجرے بناتی ہے وہ اِرد گِرد کی حفاظتی تدابیر ہیں۔ کیج کے گِرد سب سے پہلے خاردار تار کے گول گول چکّروں کی باڑ ہے۔ اِس کے بعد ہاف ٹریک۔ پھر ایک راستہ ہے جِس میں گارڈ پھرتے رہتے ہیں۔ اِس کے بعد ٹرپ فلیئرز کی باڑ ہے۔ اُس سے آگے چاروں طرف زمین دوز مائینز ہیں۔ آگے خوانخوار کتے چھوڑے ہُوئے ہیں جو چکّر لگاتے رہتے ہیں۔ اُن کے بعد مزید گارڈ ہیں جن کے لِئے الگ بیرکیں بنی ہُوئی ہیں۔ کچھ گارڈ اُن کے اُوپر اَور کچھ نیچے پھرتے ہیں۔ ہر طرف سرچ لائٹیں نصب ہیں جو بھری دوپہر میں بھی جلتی رہتی ہیں۔ اِن اقدامات سے معلوم ہوتا ہے جیسے ہم نہتے قیدی نہیں بلکہ ایک فوج ہیں جو اندر توپیں گاڑے بیٹھے ہیں۔ اِن بزدل بنیوں کی ذہنیت ہی ایسی ہے۔ البتہ اِس سے ایک فائدہ ہوا ہے، کہ شکست خوردگی کا احساس جِس نے پہلے چند روز تک ہمیں پژمردہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رکھا تھا، یہ صورت دیکھ کر غصے میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔ ہمارے دِلوں میں قوتِ مزاحمت بڑھتی جا رہی ہے اَور یہاں سے فرار کا اِرادہ پکا ہوتا جا رہا ہے۔

ہمارے کیمپ کے بعد ایک چھوٹا سا میدان ہے۔ صبح سویرے میدان میں فال اِن کرا کے ہماری گنتی کرائی جاتی ہے۔ اس کے بعد ناشتہ ملتا ہے، جو ایک خشک روٹی اَور پھیکے پانی کے سے شوربے پر مشتمل ہوتا ہے۔ دِن بھر ہم لوگ تقریباً فارغ ہوتے ہیں۔ میری بیرک میں ہم چھ آدمی ہیں۔ چار ہم انفنٹری کے افسر ہیں۔ ہم چاروں کا گروپ بن گیا ہے۔ لفٹننٹ فضل، کیپٹن عزیز، کیپٹن افتخار، اَور میں۔ رینک سینئر جونیئر ہونے کی وجہ سے ہم فوجی آداب کا خیال تو رکھتے ہیں، مگر سوائے اِس کے ہمارے درمیان مکمّل برابری کی فضا ہے۔ ہم چاروں کے علاوہ ایک ایئرفورس کا آفسر ہے۔ وہ پینتیس کے لگ بھگ کا وِنگ کمانڈر ہے۔ اُس نے آتے ہی ڈاڑھی بڑھا لی ہے اَور پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہے۔ چھٹا آدمی انجینئرز کور کا ہے۔ وہ مذہب کی جانب راغب تو نہیں ہوا، اَور نہ ہی اُس کا کوئی اَور شغل ہے۔ مگر وہ خاموش طبیعت ہے اَور الگ تھلگ رہتا ہے۔

دوپہر کے وقت تک ہم بیرک میں بیٹھے یا میدان میں کھڑے باتیں کرتے ہوئے وقت گزارتے ہیں۔ کبھی کبھی ایک آدھ ہندوستانی اخبار مل جاتا ہے، جِس کا ایک ایک لفظ ہم پڑھ کر چھوڑتے ہیں، گو ہمیں معلوم ہے کہ صرف وہی اخبار ہمیں مہیا کیا جاتا ہے جِس میں ہمارے خلاف پروپیگنڈا، یا ہمیں بدزن کرنے کے لِئے کسی ہندو یا سرکاری مسلمان کا لکھا ہوا میٹیریئل ہوتا ہے۔ مگر ہم اسے وقت گزاری کے لِئے پڑھتے ہیں۔ دوپہر کا کھانا بھی روٹی اَور پتلی سی دال کا ملتا ہے۔ روٹی کا آٹا مٹی ملا ہوا ہوتا ہے جو دانتوں میں کِرچ کِرچ کرتا ہے۔ دال ایک عجیب نسل سے تعلق رکھتی ہے۔ اِسے موٹھ کی دال کہتے ہیں۔ میں نے تو یہ دال اَپنے علاقے میں نہیں دیکھی۔ وَیسے تو یہ ثابت دالوں کی طرح گول دانے دار ہوتی ہے، مگر اندر سے خالی ہوتی ہے۔ اس کے اندر گودا نام کو نہیں ہوتا، صرف چھلکا ہوتا ہے اَور اندر پانی بھرا ہوا ہوتا ہے۔ دانت میں دباؤ تو دانہ چھوٹے سے غبارے کی طرح پھٹ جاتا ہے اَور یوں لگتا ہے جیسے چھلکے کے سَاتھ روٹی کھا رہے ہیں۔

میدان کے اندر پانچ وقت باجماعت نماز ہوتی ہے۔ زیادہ تر لوگوں نے کچھ دِل کو سہارا دینے اَور کچھ وقت گزاری کے لِئے مذہب کی جانب رجُوع کر لیا ہے۔ چند لوگ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میدان کے کونے میں تھوڑی سی زمین پر کھیتی باڑی بھی کرتے ہیں۔ اُنہوں نے چند سبزیاں بوئی ہیں، اَور فارغ وقت وافر ہونے کے باعث بے ضرورت گوڈی کرتے رہتے ہیں۔ میں اُن سے کہتا ہُوں پودے کو جڑ پکڑنے دو، زیادہ گوڈی اچھی نہیں ہوتی۔ مگر یہ لوگ نہیں سنتے۔ یہاں پر کئی لوگوں کی خصلت بدل گئی ہے۔ بات سنتے ہیں مگر سمجھتے نہیں، اَپنی ہی کیے جاتے ہیں۔ رات کا کھانا پھر وہی روٹی اَور موٹھ کی دال کا پانی، جِس کے اندر کبھی کبھی کسی گلی سڑی ہُوئی سبزی کی جڑ تیر رہی ہوتی ہے۔

آٹھ دس دِن اِس جگہ پہ رہنے کے بعد آدمی کا دھیان صرف ایک چیز پر جم جاتا ہے، اَور وہ اگلے وقت کا کھانا ہے۔ کھانا جِس کو ہم عام زندگی میں اِس لائق نہیں سمجھتے کہ اِس پر توجہ صرف کی جائے اَور جو اَپنے وقت پر گویا خُود بخود سامنے آ موجود ہوتا ہے، وہی کھانا ساری زندگی کا محور بن جاتا ہے۔ آج تک میرے نزدیک کھانے کا رشتہ صرف اِشتہاء سے رہا ہے۔ بلکہ ہم ایسی شکم سیر زندگی بسر کرتے ہیں کہ ایک آدھ وقت کا کھانا چھوٹ بھی جائے تو فرق نہیں پڑتا۔ اِشتہاء محسُوس ہو تو کھانا جَب چاہیں، جہاں چاہیں، حاصل ہو جاتا ہے۔ کھانے کی جگہ ہمیشہ اشتہاء کے بعد آتی ہے۔ یہاں پر کھانے کی بے مزگی کی وجہ سے اِشتہاء ناپید ہو چکی ہے، چنانچہ کھانا اَپنی ایک الگ شخصیت اختیار کر گیا ہے۔ یہ بات بھی ہمارے علم میں ہوتی ہے کہ اگلا کھانا وہی پانی والی دال اَور ریت والی روٹی کا ہو گا، مگر اِس کے باوجود دِل میں کسی خوش آئند واقعے کی اُمید، کسی معجزے، کسی شعبدے کی توقع ہوتی ہے، اَور اِن سب آرزوؤں کا مرکز اگلے وقت کا کھانا ہوتا ہے۔ جَب وہ حسب معمول گزُر جاتا ہے تو پھر اُس سے اگلے وقت کا کھانا محورِ خیال بن جاتا ہے۔ یوں مستقل "اگلے وقت" کے کھانے کے گِرد جو تمناؤں کا جال بنا ہوتا ہے وہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اِس طرح ساری انسانی خواہشات اُس آئندہ آنے والے کھانے کے گِرد گھُومتی ہیں جو ذہن کی فضا میں ایک ستون کی طرح نصب ہوتا ہے، اَیسا ستون جِس تک رسائی ناممکن ہو۔ اس کی مماثلت اُن آئیڈیلز سے ہے جن کے سہارے لوگ زندہ رہتے ہیں۔

روزمرہ کی گفتگو کا بڑا حصہ بھی کھانے کی باتوں میں صرف ہوتا ہے۔ ایک افسر میجر صدیق نے کہیں سے ٹماٹر کا بیج حاصل کر کے پودا لگایا ہے، جو روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ ہماری بیرک کے علاوہ دُوسری بیرکوں والے بھی اِس پر نظریں رکھے ہُوئے ہیں۔ ہم سب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کو سرخ سرخ رس بھرے ٹماٹروں کے خواب آتے ہیں۔ دِن میں کئی بار ہم پودے کے پاس جا کر اس کا معائنہ کرتے ہیں۔ جیسے وہ ہم سب کا بچّہ ہو جیسے پالنے پوسنے اَور تندرست رکھنے کا فرض ہم سب پر عائد ہوتا ہو۔ ہم اُس دِن کا انتظار کرتے ہُوئے نہیں تھکتے جس روز اُس پہ پھل آئے گا۔

ہفتے میں دوبار گوشت پکتا ہے۔ کہنے کو یہ گوشت کا سالن ہوتا ہے مگر دراصل وہی بے نمک مرچ کا شوربہ ہوتا ہے جس کے اندر کہیں کہیں کوئی ننھا سا پچھڑا تیر رہا ہوتا ہے۔ یہ دال خور بنیئے ہمیں شاید مردہ جانوروں کا گوشت کھلاتے ہیں، گو بتایا یہی جاتا ہے کہ حلال گوشت ہے جو "مسلے" قصائیوں سے حاصل کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود اُن دو دِنوں میں ہم سب کی آنکھوں میں چمک ہوتی ہے اَور کم از کم دو ایک نوالے ہم شوق سے کھاتے ہیں۔ اس کے بعد پتا چلتا ہے کہ اشتہاء کا نام و نشان مٹ چکا ہے اَور ہم زندہ رہنے کو، یا محض عادتاً کھائے چلے جا رہے ہیں۔ پِھر بھی پہلے دو نوالوں کی حد تک خوب گہما گہمی رہتی ہے۔

کھانے کے بعد دُوسرے نمبر پر فرار کا خیال ہمارے دلوں میں ہر دم جاگزیں رہتا ہے۔ آج کل ہم نے یہاں سے فرار کی ایک سکیم کو شُروع کر رکھا ہے۔ اِسکی پلان بھی میجر شاہ زمان نے بنائی ہے۔ اس کی تفصیل اگلے خط میں لکھوں گا۔ اِس سکیم کے بارے میں ہماری عجیب کیفیت ہے۔ اس سکیم کے کامیاب ہونے کی ہمیں اُمید ہے، ورنہ ہم اتنا بڑا رسک کیوں لیں۔ مگر ساتھ ہی، جیسا کھانے کے بارے میں ہمارا رویہ ہے، وَیسا دِل کے اندر ہمیں یہ بھی علم ہے کہ وقت آنے پر ہمیں ناکامی کا سامنا کرنے پڑے گا۔ یہاں پر ہر ایک کے اُوپر ایک ساتھ اُمید اَور نااُمیدی کی کیفیت طاری رہتی ہے، جوان کیمپوں کی خاصیت ہے۔ یہ ہر دو جذبے ہم وقت گزاری کے لئے، یا محض عادتاً اختیار کر چکے ہیں۔

ہم سب کا وزن دِن بدن کم ہوتا جا رہا ہے، سوائے چار چھ لوگوں کے جو ہمارے کیچ کی دوسری بیرکوں میں رہتے ہیں۔ وہ نماز کے علاوہ زیادہ تر وقت نفل پڑھنے اَور وظیفہ کرنے میں صرف کرتے ہیں، اَپنی تین وقت کی روٹی ہڑپ کر جاتے ہیں اَور جو پتلا شوربہ اَور دال کے بلبلے بچ رہتے ہیں اُنہیں برتن اُٹھا کر پانی کی طرح پی جاتے ہیں۔ پھر جلد ہی وہ خواب خرگوش میں محو ہو جاتے ہیں تاکہ تہجد کے وقت اُٹھ کر پِھر اَپنی روٹین شُروع کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیں۔ بیچ بیچ کے وقت وہ تسبیح رولتے ہُوئے اِدھر سے اُدھر پھرتے رہتے ہیں اَور کسی دوسرے آدمی سے بہت کم بولتے ہیں، یا پھر شیشے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں مُنہ دیکھتے ہُوئے ڈاڑھی کے فالتو بال نوچتے رہتے ہیں۔ صرف یہ لوگ ہیں جو مکمل اطمینان سے روزبروز فربہ ہوتے جا رہے ہیں۔ مجھے اِن کا فارمولا پسند ہے، اَور کئی بار دِل میں حسرت پیدا ہوتی ہے کہ اِسے اَپنا لوں، مگر افسوس کہ خواہش رکھنے کے باوجود اِسے اختیار نہیں کر سکا۔ کتنے خوش قسمت ہیں یہ لوگ!"

یہاں پہنچ کر سرفراز نے خط کا مضمون ختم کر دیا۔ یہ جھوٹ موٹ کا خط تھا۔ یہ وہ خط تھا جو وہ لکھنا چاہتا تھا، مگر اُسے علم تھا کہ لکھ نہیں سکتا۔ چنانچہ اُس نے اپنے لِئے ایک فارمولا ایجاد کر لیا تھا۔ وہ قلم کا اُلٹا سرا کاغذ پر رکھ کر لکھنا شُروع کر دیتا اَور لکھتا جاتا یہاں تک کہ اُس کا ہاتھ تھک جاتا۔ گو کاغذ پر لفظ نمودار نہ ہوتے، مگر سرفراز کے اندر اَپنے قریبی لوگوں کو اصل حالات سے آگاہ کرنے کی جو ناقابل برداشت خواہش تھی، وہ کچھ نہ کچھ پُوری ہو جاتی تھی۔ کیمپ کی فضا میں اُمید اَور نااُمیدی کی جو ملی جلی کیفیت ان کے اندر سرائیت کر چکی تھی وہ خُود فریبیوں کا ملغوبہ تھا۔ اسے وہ دِن کاٹنے کی خاطر سنبھال کر رکھے ہُوئے تھے۔ سرفراز جھوٹ موٹ کے خط سے دِل کا غبار نکال چکتا تو قلم سیدھا کرتا اَور اصلی خط شُروع کرتا۔ اُن سب کو ایک ایک کارڈ دیا جاتا تھا، جِس کے اُوپر پتہ پرنٹ کیا ہوا تھا: کیمپ ۹۸۔ بھارت۔ اِس کارڈ پہ اُنہیں پچیس لفظ لکھنے کی اجازت تھی۔ سرفراز لکھتا۔

ڈیرسٹ چھیمی: میری صحت بالکل ٹھیک ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ ہماری نگہداشت درست ہو رہی ہے۔ زندگی معمول کے مطابق گزُر رہی ہے۔ تمہارا سری۔"

اُمید اَور نااُمیدی کی ویسی ہی کیفیت اعجاز کے اِرد گِرد بھی پھیلتی جا رہی تھی۔ جیسے ہی اُس کی پارٹی کی حکومت آئی، اُمید و بیم، توقعات، خواہشات اَور مطابات چھلانگتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھلانگتے ہُوئے آوارد ہُوئے۔ مگر جوں جوں دِن گزرتے گئے یہ راز، جو کوئی راز بھی نہ تھا، اُن پر آشکار ہوتا گیا کہ جو کام پہلے نہ ہوتے تھے، وہ اب بھی نہیں ہو رہے۔ گو ملک کا مشرقی حصہ بنگلہ دیش بن چکا تھا اَور اُن کا لیڈر موت کی کال کوٹھڑی سے رہا ہو کر واپس جا چکا تھا، مغربی حصے میں مارشل لاء ابھی قائم تھا۔ اُن کا لیڈر دُنیا کا پہلا سویلین مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن چکا تھا اَور اُس کے وزیر اَپنے اَپنے محکموں کے افسروں سے کام سیکھ رہے تھے۔ عوام کے محکمانہ کام اُنہی افسروں کے ہاتھ میں تھے جن کے اختیار میں پہلے تھے اَور بندوبست اُسی رفتار سے جاری تھا جیسا ہمیشہ سے چلا آیا تھا۔ لیڈروں کے وعدے وعید حکومتی گورکھ دھندوں میں پھنس کر غائب ہو چکے تھے۔ نااُمیدی جڑ پکڑ رہی تھی۔

جنگ میں شکست کے احساس نے قوم کے دِل کو شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ نہ شکنجہ ڈھیلا ہوتا تھا، نہ جذبات کو نکاس کا رستہ ملتا تھا۔ ایک "صُمٌ بُکمٌ" کی کیفیت تھی جس نے اِسے موضوع ممنوعہ کی حیثیت دے دی تھی۔ گویا لوگ دِلوں کے دروازے بند کر کے اندر بیٹھ گئے ہوں۔ اندر اندھیرے کی فضا تھی۔ آٹھ دس ماہ تک مستقل روشنی مَیں رہنے کے بعد اندھیرے کے بعد اندھیرے کا پردہ یکدم جو گرا تو لوگوں کو معلوم ہوا کہ وہ روشنی جو اُنہیں دیکھائی جا رہی تھی، دِن کی روشنی نہ تھی بلکہ رات کی روشنی تھی جو ہاتھ سے جلائی گئی بتیوں سے پیدا کی گئی تھی، جس کے اندر اُنہیں فریب نظر کے کرشمے دِکھائے جاتے رہے تھے۔ جَب ہوا تیز چلی اَور بتیاں بجھ گئیں تو تاریکی ہی تاریکی تھی جس میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا اَور لوگ دم بخود بیٹھے تھے۔ اس قوم کو کئی بار لڑائی کے میدانوں میں ہار ہُوئی تھی۔ سینکڑوں برس کے زمانے میں جنگوں سے سابقہ پڑا تھا، کبھی جیت ہُوئی تھی کبھی ہار۔ مگر کبھی شکست کا احساس نہ ہوا تھا۔ کبھی ہمت نہ ٹُوٹی تھی۔ اب اِس فریب کاری نے جو اَپنے ہی لوگوں نے اَپنی قوم پر روا رکھی تھی، اِس حربی ہار کو شکست میں تبدیل کر دیا تھا۔ قوم کی ریڑھ کی ہڈی میں جو لوہے کی سلاخ تھی وہ دوہری ہو چکی تھی۔ کوئی کھلے بندوں اِس کا ذکر نہ کرتا تھا، مگر لوگوں کا اعتبار پہلے دوسروں پر، پھر اَپنے آپ پر سے اُٹھنا شُروع ہو گیا تھا۔ اُن کا چارا کچھ ایسی کیفیت سے تھا کہ جیسے وہ بازار تک گئے ہوں اَور جَب واپس آئے ہوں تو گھر کا آدھا سامان چور اُٹھا کر لے جا چکے ہُوں۔ سامان کا نقصان صرف آنکھوں کے سامنے تھا، مگر ذِلت اَور بے بسی کا احساس دِل پہ وار کرتا تھا، کہ کوئی اُن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے دروازے میں داخل ہو کر للکارتا ہوا دُوسرے راستے سے نِکل گیا تھا۔ ناطاقتی کے اِس احساس سے ہر شے پہ اعتبار اُٹھ چکا تھا۔ اعتبار کے اُٹھ جانے سے مستقبل کا دِکھاوا پامال ہو چکا تھا۔ یقین محکم جیسے الفاظ محض نعرے دکھائی دینے لگے تھے۔ ہار اَور جیت بے معنی ہو چکی تھی۔ اُن کے ساتھ دغا ہوا تھا۔

یہ تاریخ کا عجیب کھیل تھا کہ اعجاز اَور سرفراز ایک دُوسرے سے ہزاروں میل دُور ہونے کے باوجود اِسی اُمید اَور نااُمیدی کی گدلی فضا میں سانس لے رہے تھے جس کے ماضی نے حال کو جنم دیا تھا۔ مگر حال بانجھ ہو چکا تھا اَور مستقبل کو جننے سے قاصر تھا۔ بڑے بڑے صاحبان اقتدار اِس حد تک اعتماد سے عاری ہو چکے تھے کہ سب سے پہلے اِس چھینا جھپٹی میں شامل ہو گئے۔ سن سینتالیس کی تاریخ دہرائی جانے لگی۔ اُس وقت یہ تاریخ ایک وسیع و عریض المیئے کی پیداوار تھی۔ جب دہرائی گئی تو اِس نے ایک مضحکے کی صورت اِختیار کر لی۔ اب مُلک چھوڑ کر بھاگنے والے ہندوؤں اَور سکھوں کا مال اِن کا ہدف نہ تھا۔ اب لوگ اَپنے بھائی بندوں کے مقابل کھڑے تھے۔ سب تعلق اَور واسطے دِلوں سے فرار پا چکے تھے۔ تاریخ نے اَپنے سے سبق نہ سیکھنے والوں پہ غضب کے قہقہے لگانے شروع کر دیئے تھے۔

اعجاز انتہائی انتشار کے عالم میں تھا۔ ایک طرف اُسے بھائی کے جنگی قیدی بن جانے کا غم کھائے جاتا تھا۔ دُوسری جانب اُس پہ اَپنے حمایتوں، پیروکاروں غریب مزدوروں کا دباؤ تھا، جو اُس سے اَپنی توقعات پُورا کرنے کا مطالبہ کرتے تھے۔ تنخواہوں میں اضافے کی تکرار، ہڑتالیں، تالہ بندیاں، مہنگائی، اِن سب چیزوں کا بوجھ اُس پہ آ پڑا تھا۔

ابھی لیبر کے بارے میں کوئی نئی قانون سازی نہ ہو سکی تھی، مگر محنت کش صبر کی تلقین پہ سیخ پا ہوتے تھے۔ یہ بھی اعجاز کے ساتھ ایک مذاق تھا کہ اَپنی حکومت آنے پر اُسے پتا چلا کہ وہ اَور اُس جیسے دُوسرے لوگ کتنے بے اختیار تھے۔ وہ افراتفری کے عالم میں ہر طرف بھاگا پھرتا تھا۔ اُوپر سے سکینہ کا اِصرار دِن رات جاری تھا۔

"تمہیں تو نہ آج وقت ملے گا نہ کل۔ زمین بنجر ہو رہی ہے۔ ابا چار پانچ کِلّے کر سکتا تھا، وہ اُس نے کر دیئے ہیں۔ سال کے دانے گھر میں آ گئے ہیں۔ ابّے کے سَر کو دعائیں دو۔ اِس سے زیادہ وہ نہیں کر سکتا۔ میں صرف بیلنے کے کام کا ذمہ لیتی ہوں۔ خُدا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کا شکر کرو کہ گڑ کی منڈی تیز ہو گئی ہے۔ دُوسرا مربع ٹھیکے پر دے دو۔ ابے کے پاس لوگ آ رہے ہیں۔ اِتباری ہیں۔ ٹھیکہ وقت پر دینے کی گرنٹی دیتے ہیں۔ ابا نگرانی کرنے کو تیار ہے۔"

گڑ کا کام شروع کرنے سے پہلے اعجاز خُود دُوسروں کی زمین ٹھیکے پر لے کر کاشت کرتا رہا تھا۔ جب گڑ کا کام چل نکلا تو اُس نے اپنی زمین خرید لی تھی۔ مگر اُس کی مصروفیت اِتنی بڑھ گئی تھی کہ بیس پچیس ایکڑ گنے کی کاشت کے علاوہ باقی کی زمین خالی چھوڑ رکھی تھی۔ کسی نامعلوم وجہ کی بنا پر اپنی زمین کو کسی دُوسرے کے ہاتھ میں دینا اُسے کبھی گوارا نہ ہوا تھا، خواہ وہ ٹھیکے دار ہوں یا آدھے کے مزارعے ہُوں۔ اِس تجویز کی اُس نے ہمیشہ مخالفت کی تھی، گو جب بھی پُوچھا گیا وہ کوئی مناسب وجہ بیان نہ کر سکا تھا۔ مگر اب ایسا موقعہ آیا تھا کہ اُس کے دِل اَور دِماغ کی سطح نرم پڑتی جا رہی تھی، جیسے اُبال کھا کھا کر اُس پہ ننھے ننھے بلبلے پیدا ہو گئے ہوں۔ سرفراز کی قید نے اُس کی کمر توڑ دی تھی۔ آخر سکینہ کے آگے بھی اُس کی ہمت جواب دے گئی۔

"اگر ٹھیکہ وصول نہ ہوا تو پھر میرے پاس دوڑتی ہُوئی نہ آنا" اُس نے جواب دیا۔

سکینہ نے اُسے راہ پہ آتے دیکھا تو آ کر اُس کے پاس چارپائی پہ بیٹھ گئی۔ جہاں وہ لیٹا تھا۔ "گرنٹی ہے گرنٹی۔ بیاسی کے وڑیچ ہیں۔ اِتباری ہیں۔ وہاں کی چوکی میں باسے کا جماتی آ کر سپاہی لگا ہوا ہے۔ چوکی کا حوالدار بھی باسے کا واقف کار ہے۔ پلس سے بڑی گرنٹی کیا ہو سکتی ہے۔"

اعجاز نے سکینہ کی پشت پہ ہاتھ رکھا۔ اُس کی پتلی سی قمیض پسینے سے گیلی ہو کر پشت سے چمٹی ہُوئی تھی اَور اُس کے جسم سے پسینے کی ہلکی ہلکی باس اُٹھ رہی تھی جیسے پھٹے ہُوئے دودھ سے اُٹھتی ہے۔ چاچے کے ٹبر کی کاٹھی بہترین ہے، اعجاز نے سوچا۔ سکینہ کا بدن آج بھی اُس طرح ہے جیسا بیاہ والے دِن تھا۔ اس کی چھاتیوں کو کسی سہارے کی ضرورت نہ پہلے تھی نہ اب ہے۔

اعجاز کا ذہن اَپنے بکھیڑوں سے فرار حاصل کر کے جسم کی راحت کی جانب مبذول ہونے لگا۔ "یہ کیسی گرنٹی ہے،" وہ ہنس کر بولا، "کل پولیس والے تبدیل ہو جائیں تو